سفرزاد
اُسامہ خالد

چیخ سکی دروازوں کی؟
جیسے مت جاگتے ہوں

وان کیا ہے سارا گھر ویرانی کو
اپنا بستر وڑے میں لگوایا ہے

ھر کے ہاتھ پہنچتے ہیں آنکھ کی جانب
کچھ ایسی طرز سے گریہ کناں ہوا ہوں میں

صبح ہوتے ہی مجھے تو بھی نہیں ملتا یہاں
اور اک دھند بھی گھر سے نکل جاتی ہے

کوئی ملال ہوں؟ دکھ ہوں؟ بتاؤ کیا ہوں میں
دنوں کے بعد کسی شخص کو دکھا ہوں میں

زمین پر کچھ ہمارے بھی قرض ہیں جو ہم نے نہیں جتائے
ہم اس کی ویرانیاں منانے میں اپنے مردے لگا رہے ہیں

خامشی نام کی اک شے ہے مرے سینے میں
تو مجھے ہاتھ لگا دیکھ ابھی ٹوٹ گئی

سانس دیوار ہے جیون کی بہت خستہ مزاج
دو منٹ ٹیک لگے اور بھلی ٹوٹ گئی

بہشت پھینک چکی ہے زمین پہ مجھ کو
خدا کا شکر تجھے راس آ گیا ہوں میں
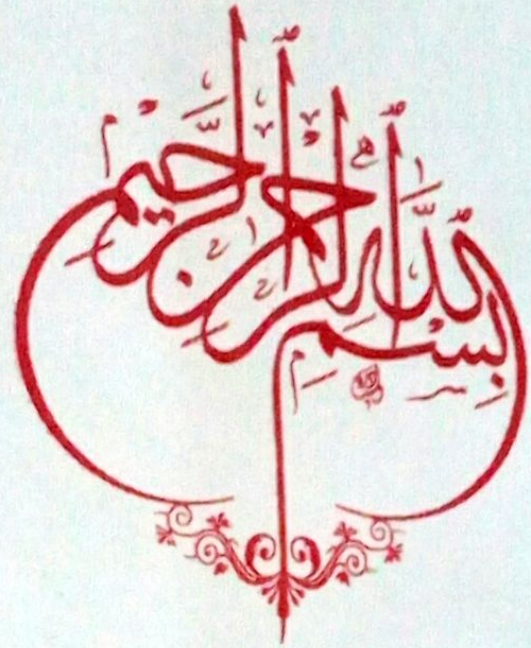
سفرزاد

یہ دن ہے امانت کسی درویش صفت کی

اور رات تری آنکھ کے کاجل سے بنی ہے

سفرزاد

اُسامہ خالد

سخن سرائے پبلی کیشنز۔ ملتان
sukhan.saraye@gmail.com
0301-7434323,0333-6151765

نام کتاب : سفرزاد

شاعر : اُسامہ خالد

سرورق : فیض شیخ

اشاعت اوّل: اگست ۲۰۱۸ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۳۰۰ روپے

کمپوزنگ : حسن کمپوزنگ، گلگشت ملتان

پرنٹر : جویریا پرنٹنگ پریس

سخن سرائے پبلی کیشنز۔ ملتان
sukhan.saraye@gmail.com
0301-7434323,0333-6151765

انتساب!

پیاری امّی اور ابو جان

کے نام

زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا
مرے مرنے پہ واویلا کرے گا
میں پتھر ہوں سو ٹھوکر کے لیے ہوں
تمہارا کام آئینہ کرے گا

فہرست

غزلیات:

نظمیں:

....

اُسامہ خالد اور شعر گوئی

دورِ حاضر کی ادبی دنیا میں ہم آئے دن یہ سُنتے رہتے ہیں کہ فلاں بڑا شاعر ہے اور فلاں چھوٹا۔ میں اپنے تئیں اس بات سے مکمل اختلاف نہیں کرتا مگر میرا یہ ماننا ضرور ہے کہ جب تک کوئی شاعر آپ کے جذبات کی مکمل عکاسی نہیں کرتا، وہ آپ کے نزدیک بڑا شاعر نہیں ہوسکتا۔ جب کہ دوسری طرف ایک شاعر کے کلام میں آپ کے جذبات کی مکمل نہیں تو جزوی عکاسی بھی موجود ہوتو وہ آپ کے نزدیک پسندیدہ اور بڑا شاعر ہوتا ہے۔

اُسامہ بھی اپنی دنیا کا بڑا شاعر ہے۔ جدید لہجے کا ایسا شاعر جس کی شاعری میں کرافٹ اور مضمون کے ساتھ ساتھ دکھ اور احساس کا عنصر وافر مقدار میں موجود ہے۔ میں اس بات کا ضامن ہوں کہ اُسامہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کا دکھ محسوس بھی کرتا ہے اور اسے اپنے اشعار میں ڈھالتا بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ''سفرزاد'' کو ادبی دنیا میں خوش آمدید کہا جائے گا۔ جس سے اُسامہ کے شعری سفر کو جلا ملے گی۔ اُسامہ کو پہلی کتاب کی اشاعت پر بہت مبارک۔

محبت اور دعائیں۔

رہے نام سچے کا!

زین شکیل

۴ جولائی ۲۰۱۸ء

معاصر تازہ فکر شاعر

تنقیدات میں قرأت کے مندارج کے تعین سے تفہیم خاصی مربوط اور آسان ہوگئی ہے۔ آپ جب کسی لکھت کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کو اس لکھت کے ساتھ جو معاملات کرنے پڑتے ہیں انہیں ''توقع۔۔۔ خبث/ پریشان کن خیالات۔۔۔ مراجعت۔۔۔ تشکیلِ نَو۔۔۔ اور طمانیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تخلیقی حذف کے متعلق بہت سُوں کو علم ہوگا کہ یہ ایک ایسا کریٹو گیپس کا کھیل ہے جس میں معنی تک رسائی کے مختلف سراغ حذف کردیے جاتے ہیں اور قاری اپنی بساط بھر کوشش سے مندرجہ بالا قرأت کے مندارج سے ہوتا ہوا لکھاری کے مطلوب معنی تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ترتیب وار مندارج ہیں سو لکھت کی قرأت کے دوران دماغ انہی ضابطوں سے ہوکر معنی کے عرفان پر طمانیت بخش احساس محسوس کرتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ آپ اس لکھت سے معنی کے متعلق کیا اُمید/توقع وابستہ کیے ہوئے ہیں اور مزید یہ کہ آپ کو معنی تک براہ راست رسائی نہ ملنے پر جس جھنجلاہٹ کا شکار ہونا پڑے گا اس سے یا تو آپ اس لکھت کو ہی تج دیں گے یا ماضی کے تجربات اور مشاہدات کی طرف رجوع کریں گے اور اس رجوع سے آپ کے پاس معنی کی تفہیم کے لیے مواد کی رسد پہنچ جائے گی۔ معنی کے ظہور پر جس سکون بخش کیفیت کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اسے بعضوں نے بہت جلد حاصل کر لینے کی ٹھان لی ہوتی ہے، جو قرأت کے مندارج کی ہی نفی ہے اور اس سبب سے لکھت تو گجا لکھاری بھی اپنی شخصی/تخلیقی موضوعیت میں تدریج سے ناواقف ہوتا چلا جارہا ہے۔

اُسامہ خالد کے شعر میں شفافیت بہت ہے اور اس تناظر میں موضوعی سلاست محض قافیہ پیمائی اور بالخصوص ردیف پیمائی سے کلام نہیں کرتی بلکہ سنجیدگی کو جنم دیتی ہے۔ دوسری اہم بات جو میں نے

سفر زاد - اُسامہ خالد

اُسامہ کے شعر میں محسوس کی ہے وہ یہ کہ شعر اپنی پوری توانائی استعمال کرنے کی بجائے مختلف انگ ظاہر کرتا ہے اور مختلف چھوٹے چھوٹے ڈرافٹس میں الگ الگ طرح کے منظرنامے تشکیل دیتا ہے جو بعد ازاں ایک مکمل جگزا پزل کا روپ دھار لیتے ہیں۔

اُسامہ کے شعر کا مرکزہ رائیگانی کے باطن سے پھوٹتا ہے اور رائیگانی ظاہر ہے انسانی المیہ ہے اسے شعری وثوق میں ڈھالنا بہت مشکل اَمر ہے۔ لیکن اُسامہ کے ہاں یہ کامرانی سے ہمکنار نظر آتا ہے۔ لکھنؤ مکتبۂ فکر کے ہاں جن کلیشے مضامین کی بھرمار تھی ان میں وہ تمام تر عمومی جذبات ہی تھے جن میں موت، دکھ درد، انسانی ناپائیداری اور رائیگانی وغیرہ جن کی رُو سے لکھنؤ کے شعراء میں بڑے پیمانے پر توارد ہونے لگا اور اب ہم چونکہ ایک ایسی صدی میں سانس لے رہے ہیں جو دو صدیوں کا سنگم ہے۔ بیسویں صدی کے اقدار اکیسویں صدی کے تنگ مزاج سے ٹکرا رہی ہے۔ اسی لیے کلامیے کی سطح پر نئی حسیت کا در آنا لازم ہے۔ اُسامہ کے شعر میں تندی کم اور ٹھہراؤ زیادہ ہے اور یہ ٹھہراؤ ممکن ہے آئندہ کچھ برسوں میں لاوے کی شکل اختیار کر لے۔ بہرحال اُسامہ کے مضامین میں عموم سے قدرے مختلف رنگ ہے اور ظاہر ہے کہ انفراد یا اختلاف کے دو ہی اصول ہوتے ہیں، ترکیبی عناصر میں ردو بدل یا یکسر نئے اجزاء۔ اُسامہ کے شعر میں اس وقت ترکیبی عناصر میں ردو بدل کا معاملہ صاف دیکھا جا سکتا ہے اور کہیں کہیں یکسر نئے اجزاء بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اُسامہ خالد کی تخلیقی قوت سلامت رہے۔

محبت اور دعائیں!

علی زیرک

حروفِ سپاس

خالقِ نطق و دہن کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے مجھ ناچیز کو بولنے کی طاقت عطا کی۔
میرے نزدیک شاعری جذبات و احساسات سے پھوٹنے والی خوشبو ہے جو لفظوں کا پیرہن اوڑھتی ہے۔
میرے نزدیک ہر شاعر کی اپنی ڈومین (Domain) اور رینج (Range) ہے جو کہ اس کے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ شاعر اسی کے اندر رہ کر اپنی بات کہہ سکتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں اپنے تجربات اور مشاہدات میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں مگر میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ میں اپنے کام سے اس حد تک مطمئن ہوں کہ احباب نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی فرمائی لیکن ابھی بھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔
مجھے اس بات کی بھی بے حد خوشی ہے کہ مجھے قارئین کی طرف سے ہمیشہ پذیرائی ملی ہے۔ میری شاعری کے بارے میں ان کی آراء مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔

میں اپنے والدین کے ساتھ ساتھ اپنے استادِ محترم زین شکیل اور اپنے دوستوں میں مجیب الرحمن، توکل شیخ، شرجیل بٹ، اویس چنڑ اور آپی رابعہ بصری کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

اپنے شاعر دوستوں میں طہٰ ابراہیم، عرفان حیدر، مصباح اجمل، افتخار فلک، عدیل مرتضیٰ اور دیگر تمام احباب کا شکر گزار ہوں جن کی قیمتی آراء میرے شاملِ حال رہیں۔
آخر میں آپ سے گزارش ہے کہ "سفر زاد" کو پڑھ کر اپنی قیمتی رائے سے مجھے ضرور نوازیں۔
رہے نام سچے کا!

اُسامہ خالد

نعت

نظم معذور تھی

سبز احساس کی روشنی نے اسے زندگی بخش دی

زندگی میم سے منسلک دھڑکنوں کا جہانِ اماں

میری آقاؐ سے نسبت نہیں تو کہاں

سبزگی! زندگی! روشنی! دلکشی!

بدنُما ہے زمیں، آسماں، سب جہاں

اس جہاں سے جڑا ہر یقیں عیب ہے

ہر نشاں بے نشاں

ہر خوشی بے سُری

ہر دوا بے اثر

میرے آقاؐ! مری ہر خوشی آپؐ سے

میرے دونوں جہاں، زندگی آپؐ سے

بعض اوقات تو دھڑکے دل میں اتنا شور مچاتے تھے
اُس کا میسج آتے، آتے ہم بوڑھے ہو جاتے تھے

اک تفتیش نے تیری حسرت کو مجرم ٹھہرایا ہے
آنکھ لحد سے رات گئے مُردے چوری ہو جاتے تھے

ایسا دُکھ تھا رونے کو میں کندھے ڈھونڈا کرتا تھا
اور اس رنج پہ قبرستان سے مُردے رونے آتے تھے

ہاتھ جکڑ لینے سے چہرہ وحشت سے بچ جاتا تھا
روز بروز اک بیماری کے ناخن بڑھتے جاتے تھے

بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تھے قوت جانے لگتی تھی
جب نیلی آنکھوں کے پیچھے صحرا دیکھنے جاتے تھے

کب دَبے پاؤں مری نیند میں آتا تھا مجھے
آپ کا خواب سرِ راہ ستاتا تھا مجھے

مجھ کو دم توڑتے سائے سے بڑی نفرت ہے
وہ بہت چیخ کے یہ بات بتاتا تھا مجھے

ہائے اُس شوخ ستمگر کی جوانی بھی گئی
حالتِ وصل میں جو ہجر سکھاتا تھا مجھے

اک الارم سے مرے خواب کا بُت ٹوٹتا تھا
جس کا ملبہ بھی مرا تکیہ دکھاتا تھا مجھے

زندگی مجھ سے کہیں دور گزرتی رہی تھی
چلتی گاڑی سے کوئی ہاتھ ہلاتا تھا مجھے

سخت وحشی ہوں بلا وجہ بکھر جاتا ہوں
اس لیے اپنی طرف جاؤں تو ڈر جاتا ہوں

ایک ہی طرز کی وحشت سے بھرے رہتے ہیں
میں اگر دشت نہیں جاتا تو گھر جاتا ہوں

چار، چھ انچ کی دوری پہ مرا سایہ مجھے
اک صدا دیتا ہے میں بارِ دگر جاتا ہوں

بعض اوقات اُداسی کو منانے کے لیے
اپنے ہونے کی دلیلوں سے مکر جاتا ہوں

لفظ بُنتے ہوئے آتا ہوں سڑک پر اور پھر
جانے کیا دھیان میں آتا ہے ٹھہر جاتا ہوں

گھر سے دفتر گیا، دفتر سے گھر آیا اب دشت؟
ویسے بنتا تو نہیں جانا مگر جاتا ہوں

○

ہوائے شام ترے ریشمی بدن کی طرح
ہم اِک سکوت سے باہر نہیں نکل پائے

اک ایک سانس اُکھڑ گئی تمام پور شل ہوئے
مگر کھلے نہ بھید مجھ پہ اُس قبائے بند کے

بدن پہ ضرب بھی نہیں تھی پھر بھی پور لے اُڑی
جگر میں تیر بھی نہیں تھا پھر بھی چیختے رہے

وہ سرخ روشنی تھی سب کی آنکھ میں اُتر گئی
ہم آخری چراغ تھے ہوا کی نذر ہو گئے

نجانے کس کی یاد تھی جو تیرے نام کی گئی
نجانے کس کے اشک تھے جو تیرے واسطے بہے

خمیر اُٹھ رہا تھا بین کا ہم اضطراب میں
اخیر لالچی بنے سبھی کے اشک لے اُڑے

جہانِ رنگ و بُو میں تیرے آنکھ میچنے سے آج
کسی کی نیند کھُل گئی، کسی کے خواب چل بسے

○

اک رنجِ رائیگانی تھا دل میں اور ایک تُو
پھر یوں ہوا کہ تجھ کو الگ کرنا پڑ گیا

عشق کے روندھے ہوئے اور تو کیا پوچھتے ہیں
وحشتِ ہجر سے بچنے کی دعا پوچھتے ہیں

ایک زندان سے بھاگے ہوئے وحشی ہم لوگ
جو ملے اُس سے فقط گھر کا پتہ پوچھتے ہیں

پاؤں کے پیپ زدہ چھالے نہیں چوم سکے
ہم سرِ دشتِ جنوں اس کی سزا پوچھتے ہیں

بام پر رکھ دیے اس واسطے سب بجھتے چراغ
دیکھنا ہے کہ ہواؤں سے یہ کیا پوچھتے ہیں

عشق وہ راہِ زیاں ہے کہ بھٹکتے ہوئے لوگ
رائیگاں لوگوں سے منزل کا پتہ پوچھتے ہیں

اُسی نے آدم کے نقشِ پا کو ازل کیا تھا بھرم رکھا تھا
زمیں پہ جلوہ فگن نہ ہو کر بھی جس نے پہلا قدم رکھا تھا

ہم ایک ترتیب سے تمہاری اُداس نظموں پہ رو چکے ہیں
کہ آنسوؤں اور خون کے بیچ ڈیڑھ سسکی کا سم رکھا تھا

ضعیف وقتوں میں اپنے کنبے کی ذمہ داری اٹھائی ہم نے
تمہارے ابو نے منہ دکھائی میں اس ہتھیلی پہ غم رکھا تھا

اُنہی گلوں سے اب آٹھویں سُر کی میٹھی آواز آ رہی ہے
جنہوں نے ہجراں کی رات لرزش کے خاص عنصر کو کم رکھا تھا

اُسے بتانا کہ اپنے دریاؤں کی حفاظت کے کام آئے
وہ پیڑ کشتی بنے ہوئے ہیں جنہوں نے صحرا میں نَم رکھا تھا

میں ان پر غور کرلیتا ہوں کیسے بج رہے ہیں
یہ خالی ڈھول جو خوشیوں کے صدقے بج رہے ہیں

سکوتِ لب سے خائف سکھ کا بچہ مرگیا ہے
بدن ساکت پڑا ہے صرف صدمے بج رہے ہیں

اماوس رات، بارش، خامشی کا راگ اور تو
گھڑی میں ہجر، شریانوں میں گھنٹے بج رہے ہیں

پرانی گاڑیوں کی طرح جیون ہانپتا ہے
غلط جگہوں پہ ٹھونسے ٹھیک پرزے بج رہے ہیں

مروّت میں تعلق استواری کا نتیجہ
ہمیں جتنا بجایا تم نے اتنے بج رہے ہیں

خاص تکنیک میں اُس شخص سے غم ملتا ہے
جتنا ملتا ہے مجھے لگتا ہے کم ملتا ہے

رقص میں ہوش گنواتی ہوئی پائل کی قسم
لاکھ گریہ کروں تب نقشِ قدم ملتا ہے

ہائے وہ لوگ جنہیں اتنی ریاضت کے عوض
اک تناسب سے کوئی دستِ کرم ملتا ہے

عقد کے بعد بھی بستر کے دہانوں پہ رہے
اس طرح آپسی دوری کو ردھم ملتا ہے

ہم ہیں اس عہد میں دریا کی گرانی کا سبب
جن کے اشکوں سے ترے دشت کو نم ملتا ہے

پیڑ پر دھاگہ بندھا دیکھ کے حیرت کو نہ کھینچ
میکدے جائیں تو رندوں کو صنم ملتا ہے

○

کسی کو کیسے بتاؤں کہ میری آدھی عمر
مجھے مجھی سے بچانے میں صرف ہو گئی ہے

زرد منظر میں ہری گھاس نہیں آتی تھی
آ بھی جاتی تو مجھے راس نہیں آتی تھی

ایسا گنجان بدن ہوں کہ مرے بیچوں بیچ
دفن تھا ہجر مگر باس نہیں آتی تھی

میری اک عمر کٹی اس کی عزاداری میں
وہ سہولت جو مجھے راس نہیں آتی تھی

ہڑبڑاہٹ میں خوشی کو بھی تھما آیا طلاق
بسترِ غم پہ مرے پاس نہیں آتی تھی

تیرگی بانٹ چراغوں میں رہا ہوں اب تک
ایسی وحشت میں جہاں پیاس نہیں آتی تھی

میں خود پہ چیخا بچھڑ گئے ہو تو رونے دھونے سے کیا بنے گا
دروں سے آواز آئی رنج و اَلم کا کچھ حوصلہ بنے گا

یہ لوگ دریا کے اس طرف بیٹھ کے تجھے سوچتے رہیں گے
انہیں بتانا ہے مجھ کو کاٹیں تو تیرے تک راستہ بنے گا

ہمارا جیون اُداس لوگوں کی درد پُرسی میں کٹ رہا ہے
سو ایک دن اپنے نقشِ پا سے بڑا شفاف آئنہ بنے گا

وہ کہہ رہی تھی میں روزِ محشر تمہارا اُس سے گلہ کروں گی
میں کہہ رہا تھا اگر جواباً خدا نہ بولا تو کیا بنے گا

دلیل دے کر بتاؤں گا میں کہ ہجر قربت کی اصل ہے دوست
اُسے کبھی خود سے دور کر کے پرکھ لے واپس ترا بنے گا

میں جس تسلسل سے گریہ کرنے میں لگ گیا ہوں بعید کم ہے
تمام منظر سمٹ کے پتھر بنیں گے اور ٹیکسلا بنے گا

یہ خاکِ ملتان اپنی خاطر ضرور ہجرت ہے پر اُسامہؔ
یقین پختہ ہے اس کے ذرّوں سے کچھ نہ کچھ تو نیا بنے گا

○

جس کی سزا میں رب نے ہمیں بُت بنا دیا
ہم نے تمہارے ذکر پہ رونے میں دیر کی

کچھ بھولی اور کچھ تیکھی آوازیں ہیں
جیسے چہرے ہیں ویسی آوازیں ہیں

اک تطہیر سے عاری جسم کا پُرسہ ہیں
خوف میں لپٹی جتنی بھی آوازیں ہیں

چاروں جانب گھور اندھیرا ہے جس میں
آٹھوں جانب سننے کی آوازیں ہیں

ایسا محو ہوں خاموشی کو سننے میں
مانو مجھ سے پہلے کی آوازیں ہیں

گھور رہا ہوں کانوں کی ویرانی کو
چیخ رہا ہوں کیا گونگی آوازیں ہیں

اتنی وحشت طاری ہوئی کہ بھول گئے
یہ تو اپنی امدادی آوازیں ہیں

چونک پڑا ہوں میرے ویراں کمرے میں
کوئی نہیں ہے پھر کیسی آوازیں ہیں

آوازوں کا جمنا اس سے ثابت ہے
جیسے ہم خاموشی کی آوازیں ہیں

دوست ہمارے پاس اضافی کچھ بھی نہیں
مرتی سسکیاں ہیں، دبتی آوازیں ہیں

اگرچہ تیرے آنے کی خوشی ہے
مگر افسردگی، افسردگی ہے

اُداسی بھی پُرانی شے ہے لیکن
مری تنہائی اس سے بھی بڑی ہے

مری بے چارگی کی آخری حد
ترے بے فیض کندھے تک رہی ہے

وگرنہ تیرگی کس کو بچاتی
خدا کا شکر کر نامِ علیؑ ہے

مری آنکھوں کو بینائی کی دولت
محمدؐ نام چھونے سے ملی ہے

سحر ہوتے ہی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں
وہی چہرہ جو میری زندگی ہے

○

کاسۂ روح میں رکھتے ہیں کوئی کارِ جنوں
پھر کہیں رقص کی حالت میں بدن اُڑتا ہے

بھرے کمرے میں اداسی کا اثر تنہا کیا
جانے کیا بات تھی کیا سوچ کے گھر تنہا کیا

اُس سے کیا پوچھئے خاموشی کے اسباب کا دکھ
جس نے آواز کی وادی میں سفر تنہا کیا

میرے ملبے کی بچت روز کھٹکتی تھی اسے
میرے وحشی نے مجھے بارِ دگر تنہا کیا

مجھ خلا زاد میں وہ خالی جگہ چاہتی تھی
کرنا بنتا تو نہ تھا خود کو مگر تنہا کیا

اک نشست اس کے لیے خالی رکھی وحشت کی
جس کے ہمراہ محبت کا سفر تنہا کیا

ہم اگرچہ تجھے خواب میں بے رداد یکھنے کی سزا جانتے ہیں
پھر بھی اک خاص تکنیک سے تجھ کو چھونے کا ہر پینترا جانتے ہیں

ذہن میں ایٹموں کے حوالے سے کچھ تھیوریاں بھی ضروری ہیں لیکن
ہم بڑے مطمئن پھر رہے ہیں کہ اس کی گلی کا پتہ جانتے ہیں

اس علاقے میں تجھ کو ہوس کی کوئی بات بھی موت کا گھاٹ ہوگی
اس جگہ ظاہراً لوگ کاہل دِکھیں گے مگر پیٹنا جانتے ہیں

رائیگانی، اُداسی، محبت مرے پچھلے متروک اسمِ اجل ہیں
بھائی اب آپ سچ سچ بتائیں مرے بارے میں اور کیا جانتے ہیں

چند اشکوں نے گدلا دیا ہے ان آنکھوں میں عکسِ محبت وگرنہ
ہم تو جس شخص کو غور سے روتا دیکھیں اسے آئنہ جانتے ہیں

کوئی نصیب کو ایسے بدل گئی ہے دوست
بغیر گولی کے بندوق چل گئی ہے دوست

دعا سلام سے آگے چلا گیا رشتہ
زمیں مدار سے باہر نکل گئی ہے دوست

فصیلِ جسم میں تیرا قدم پڑا ہے یا پھر
مہیب اندھیرے میں قندیل جل گئی ہے دوست

میں سوچ سکتا ہوں میرا یہاں پہ کیا ہو گا
جہاں پہ ہاتھی کو چیونٹی نگل گئی ہے دوست

پڑھے ہوئے تھے کشش کے سبھی اصول مگر
تمہارے جانے سے تھیوری بدل گئی ہے دوست

کنڈی بجا کے اس لیے بھاگا نہیں ہوں میں
دِکھتا نہیں کسی کو تو سوچا نہیں ہوں میں

پچھلے برس کی بات ہے کچھ لوگ آئے تھے
دستک سنی تو کمرے سے چیخا نہیں ہوں میں

جانے میں کس کا جسم ہوں اور کس کے پاس ہوں
ڈھونڈا ہے خود کو ہر جگہ ملتا نہیں ہوں میں

لے جاؤ مجھ کو مجھ سے مگر ایک بات ہے
لمبے سفر کے واسطے اچھا نہیں ہوں میں

سایہ ہوں؟ اور دن ڈھلے بجھ گیا ہوں کیا؟
دیکھا ہے آج آئنہ دِکھتا نہیں ہوں میں

ناخن چبھو کے بھانپ لو مجھ میں مرا وجود
کتنا ہوں اپنے آپ میں کتنا نہیں ہوں میں

ممکن ہے یہ ملال تمہیں بھی فریب دے
جیسا مجھے بنایا تھا ویسا نہیں ہوں میں

اک اک دکاں سے پوچھا کہ میں دستیاب ہوں؟
انکار سن کے بُجھ گیا، اچھا نہیں ہوں میں!

خموش رہنے پہ یاد آتا ہے کس طرح سے اُتارتے تھے
سکوتِ شب میں تھکے بدن پر سکوں کے لمحے اُتارتے تھے

ہماری آنکھوں میں ایسے وقتوں کی جھلکیاں بھی پڑی ہوئی ہیں
کہ گھر میں داخل ہوئے تو روٹی کے بعد بستے اُتارتے تھے

یہ کائناتی ہنر تھا اپنا کہ اس کو شک بھی نہ پڑتا تھا اور
ہم اس بدن پر لگے رقیبوں کے سرخ بوسے اُتارتے تھے

طویل عرصہ تو موت کی چاشنی کے آگے جھکے رہے ہم
اسی تجسس میں روز قبروں کے بیچ مُردے اُتارتے تھے

ہمارے ہاتھوں کو رائیگانی کے بعد کا دکھ لپیٹتا تھا
سو ہم درختوں سے خودکشی کے مہیب رسّے اُتارتے تھے

اگرچہ اس سے کھل جاتی ہے ویرانی کسی کی
مگر ہم نیند میں تکتے ہیں بیداری کسی کی

درونِ خواب وحشت میں سیہ آسیب میرا
بجائے جا رہا ہے زور سے کُنڈی کسی کی

بہت تاخیر کر دیتا ہوں آنسو پونچھنے میں
بہت بیمار کر جاتی ہے بیماری کسی کی

پٹاخے پھوڑنے لگتا ہے کوئی بیکراں دُکھ
ہماری عید بن جاتی ہے دیوالی کسی کی

برابر وقت پر حاصل کریں گے لذتِ وصل
مری تو موت ہوجائے گی اور شادی کسی کی

بہت ہی زرد ہوجاتے ہیں خدّوخال میرے
اُچھلنے لگ پڑے جب دل میں اسراری کسی کی

○

دسترس ہوتے ہوئے جسم کی حاجت نہ رہی
ایک سگریٹ کو جلایا تو سہی کش نہ لیا

کون سنتا ہے کس سے کہیں ہم کو درپیش کتنے بڑے سانحے ہیں
آنکھ میچے ہوئے رات کو سو تو جاتے ہیں پر خواب میں جاگتے ہیں

آج مدت کے بعد اپنی تصویر میں تجھ کو دیکھا تو روندھی پڑی تھی
ایسی راتوں کی راحت جسے نیند کی گولیوں سے بلاتے رہے ہیں

وہ خزانہ نما آنکھیں سب کی حفاظت کریں گی اسی واسطے ہم
تیر کے وار سے چھل چکے ہیں پر ان وادیوں کا پتہ دے رہے ہیں

ایسی وارفتگی ہے کہ نقشِ قدم تک نہیں مل رہا مجھ کو اپنا
کس سے پوچھوں میں ان انگلیوں کے لکھے نام آخر کہاں اُڑ گئے ہیں

خودکشی کے لیے اس سمندر میں چاروں طرف ایک منظر ہے بھائی
پانچویں سمت سے ڈوب کر دیکھئے تو بڑے دلربا ذائقے ہیں

ٹھیک ہے ان دنوں خود پر ذرا غصہ ہوں میں
پھر بھی اپنی سبھی حرکات کو تکتا ہوں میں

اک مقام ایسا بھی آتا ہے مری وحشت میں
خود کو جھنجھوڑنا پڑتا ہے کہ زندہ ہوں میں

مصلحت ڈھونڈتے پھرتے ہو سبھی کاموں میں
تم کو بیمار نہیں لگتا تو اچھا ہوں میں؟

وقتِ وحشت مجھے پہچان نہیں پاتا کوئی
پھر بتاتا ہوں فلاں شخص کا بیٹا ہوں میں

چند لمحوں کا دھواں عکس میں تبدیل ہوا
اور میں جھوم کے کہنے لگا دیکھا' ہوں میں!

تم جو چاہو تو مجھے پیڑ کا حصہ کر دو
ورنہ پیروں تلے آیا ہوا پتّا ہوں میں

سخت بیماری میں رکھتا ہوں خیال آپ اپنا
خود سے خود پوچھتا رہتا ہوں کہ کیسا ہوں میں

○

اُسے بھی ہجر سہنا آگیا ہے
مجھے بھی چائے میٹھی لگ رہی ہے

خراب ہونا بجا ہے خراب لگتے ہیں
کہ ہم تو شکل سے حاضر جواب لگتے ہیں

اب ان کی رمز بھلا کس پہ کھل سکے گی جو
سراب ہوتے ہوئے بھی سراب لگتے ہیں

تم اک سوال ہو لیکن جواب لگتی ہو
ہم اک جواب ہیں پھر بھی جواب لگتے ہیں

ہماری نیند سے حیرت تراش سکتے ہو
کہ ہم تو خواب میں بھی محوِ خواب لگتے ہیں

یہ نظریہ تھا تمہیں دیکھنے سے پہلے تک
ہمارا کیا ہے ہمیں تو ثواب لگتے ہیں

میں کیا دکھاتا اُسے عشق کی سیہ پھٹکار
کسی نے پوچھا بھکاری ہو؟ صاب لگتے ہیں!

○

وہ حسن زادی چھڑی گھمائے گی اور پھر میں
مچل کے اپنی حسیں جوانی میں حباگردوں گا

لوگ حسرت بھری دید سے دیکھتے ہیں مجھے جانے کیا چاہتے ہیں
ویسے اثرات سے لگ رہا ہے کہ سب گریے کا تجربہ چاہتے ہیں

ایک مدت سے خوشیاں دکھوں کی فصیلوں کے اندر مقیّد پڑی ہیں
بیس سالوں میں یہ ساتواں ہجر ہے اور ہم فیصلہ چاہتے ہیں

دشت ہوں موسمی چینج سے میری خشکی میں اک مستقل ربط ہو گا
جون ہے اور پیاسا بھی ہوں آپ دریا ہیں کیوں سوکھنا چاہتے ہیں

روزِ اوّل سے دنیا کی ہر چیز جوڑے میں ہے صرف اپنے علاوہ
اپنا سینہ تو اک اُجڑا مندر ہے دیکھو تمہیں دیوتا چاہتے ہیں

یہ لکیریں نہیں موت ہی موت ہیں بس زبانیں ذرا مختلف ہیں
خام تھیوری کو پختہ کریں سو ترے ہاتھ بھی دیکھنا چاہتے ہیں

جہانِ گریہ جو آدم کو خلد کا دکھ ہے
اسی لحاظ سے دھرتی، ہوا، خلا دکھ ہے

شدید رونا تو اندر کا حبس گھٹتا ہے
کھچاؤ ہنسنے سے پڑتا ہے قہقہہ دکھ ہے

زمین گول ہے میری وفات نے کھولا
کہ دوست اتنی سے کہتے تھے یہ بڑا دکھ ہے

میں بانجھ پیڑ ہوں سایہ نہ پھل مرے اوپر
مجھے سمے دے کبھی پوچھ مجھ کو کیا دکھ ہے

کبھی فراق کی راتوں میں آئنہ دیکھوں

تو خود سے کہتا ہوں دیکھو یہ آئنہ دکھ ہے

تمام خوشیاں اکٹھی تھیں ایک دکھ کے گرد

انہیں دھکیل کے پیچھا ہٹو مرا دکھ ہے

میں خود سے جنگ میں ہارا ہوا سپاہی ہوں

کہ جس کا رابطہ نمبر، اتا پتہ دکھ ہے

○

ہجر کی رات ہو، سردی ہو یا پھر تیری گلی

اک تسلسل سے مجھے موت دکھائی گئی ہے

جانتا ہوں اس کے چاروں اُور کتنی آگ ہے
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تو ٹھنڈی آگ ہے

دھوپ میں بھی سخت دھاتوں سے ڈھکا اپنا بدن
خود میں اتنا میں نہیں ہوں جتنی میری آگ ہے

کوئلہ ہو جائیں گی آنکھیں ہماری ایک دن
اس طرح کیسے چلے گا جتنی اندھی آگ ہے

اس بدن پر بیس بوسے ثبت کر دینے کے بعد
یوں لگا بس میں بشر ہوں اور باقی آگ ہے

راکھ ہونا ہے تو کیوں دوزخ کی آتش صرف ہو
اس سے اچھی تو ہمارے گھر کی اپنی آگ ہے

محاذِ عشق میں ہارے نہیں ہیں کٹ رہے ہیں
مرے اعصاب شل ہونے سے مجھ پر پھٹ رہے ہیں

غلط انداز سے اک جسم چھو کر آگ چکھی
اب اس سے عشق کے پیپر میں نمبر کٹ رہے ہیں

ہمارا کام لوگوں میں محبت بانٹنا تھا
گزشتہ دور میں ہم وصل کے پرمٹ رہے ہیں

یہ لشکر شاہزادی سے پرے جانے لگا ہے
کئی عشّاق چالاکی سے پیچھے ہٹ رہے ہیں

یہی تو نقص ہے اس بے زبانی میں اُسامہؔ
کسی کا بخت تھے اور دیکھ کس سے پٹ رہے ہیں ہیں

زمیں پر پاؤں پھیلا کر ہم ایسے سو رہے ہیں
بظاہر لگ رہا ہو گا سفید ے سو رہے ہیں

دکھوں کی چڑ چڑاہٹ دودھ مانگے کی سکھوں کا
انہیں مت چھیڑ بھائی دیکھ بچے سو رہے ہیں

یہ آنکھیں تجھ کو قبرستان کا حصہ دِکھیں گی
کہ ان میں خواب کے بستر پہ مُردے سو رہے ہیں

بدن پر نفسیاتی بارشیں ہوتی رہی ہیں
مگر اس ذہن کے مفلوج گھوڑے سو رہے ہیں

کئی مانوس آوازیں بُلاتی ہیں مگر ہم
دھنک کی ساتویں پٹی کے پیچھے سو رہے ہیں

تم اس کو عیب ہی گن لو مگر آرام دہ عیب
ہم اندھے لوگ ہیں پر تم سے اچھے سو رہے ہیں

یہ دنیا حبس کا مارا ہوا کمرہ ہے جس میں
سبھی بونے ہیں پہرے دار لمبے سو رہے ہیں

یہ ہم جو عشق کے مارے غزل سناتے ہیں
سبھی جنونی حوالے غزل سناتے ہیں

کسی کا لمس بصارت بحال کردے اگر
میں حلف اُٹھاؤں گا مُردے غزل سناتے ہیں

عجیب لوگ ہیں ان میں ذرا بھی عقل نہیں
اجل سنا نہیں سکتے غزل سناتے ہیں

ہمارے پرے کو مائیں یا بیویاں نہیں ہیں
ہم ایسے خوف کے مارے غزل سناتے ہیں

میں پُرخلوص ہوں ان کے لیے جو میرے ہیں
جو مجھ کو جاگتے سوتے غزل سناتے ہیں

میں اس قبیلے کا ممبر ہوں جس میں اہلِ عشق
نکاح کرتے ہیں جس سے غزل سناتے ہیں

ہم جو صحرا میں اس کی کلائی سے ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ڈھونڈتے ہیں
ظاہراً اک عجب بے بسی ہے کہ پانی پہ ثابت نشاں ڈھونڈتے ہیں

ایک مدت تلک میں نے بوسے شرابی گلاسوں پہ ضائع کیے ہیں
اب یہ عالم ہے وارفتگی کا مرے ہونٹ پیشانیاں ڈھونڈتے ہیں

مجھ کو بوڑھے درختوں کے نیچے جواں سال درویش کہتے ہیں ہر روز
دوستا! اس جہانِ خرافات میں سب کے سب رائیگاں ڈھونڈتے ہیں

وقت بے وقت اس روحِ آسیب کو اک جلاؤ کا دھڑکا لگے ہے
اور ہم سادہ لوح اپنا سینہ نہیں بلکہ اس کا دھواں ڈھونڈتے ہیں

ان لکیروں میں تجھ تک رسائی کا اتنا بھنور آ بسا ہے مرے دوست
جوتشی جو مرا ہاتھ تکتے ہیں کچھ دیر تک انگلیاں ڈھونڈتے ہیں

بچھڑ کر تجھ سے دل کو اتنے دھڑکے لگ رہے ہیں
کہ جیسے اس جدائی پر بھی پیسے لگ رہے ہیں

بدن پر پیاس کے حرفوں کی تختی بن گئی ہے
یہ بازو شل پڑے ہیں اور تسمے لگ رہے ہیں

ہماری موت اپنا راستہ بھٹکی ہوئی ہے
ہماری قبر کو اوروں کے مُردے لگ رہے ہیں

مرے چہرے کے بیچوں بیچ ثابت دو پھٹے ہونٹ
نئی تصویر میں زخموں کے ٹانکے لگ رہے ہیں

تناؤ سائنسی مقدار ہے دوری کی خاطر
یہ میرے بال تھے جو آج رسّے لگ رہے ہیں

تمہاری آنکھ میں ٹھہرے ہوئے کچھ ضبط کے اشک
کسی مانوس اداسی کے جزیرے لگ رہے ہیں

کچھ اس لیے وجود کرچیوں میں بٹ نہیں رہا
بدن پہ ایک بوجھ ہے جو مجھ سے ہٹ نہیں رہا

مرا دماغ ہی مرے سکوت کا وجود ہے
سو وصل میں بھی ذہن کا کھچاؤ گھٹ نہیں رہا

ملال تو یہی ہے پچھلی رنجشیں نہیں گئیں
وہ بے بسی سے چور ہے مگر لپٹ نہیں رہا

کوئی تو ہے غزل میں جس سے شعر ہو نہیں رہے
کوئی تو ہے جو تیرے خدّ و خال رٹ نہیں رہا

تمہارے قرب میں ہوں پھر بھی اپنا انہماک ہے
میں آئنہ غبارِ دشت سے بھی اَٹ نہیں رہا

کسی نے جان بوجھ کر کسی کو وِش کیا نہیں
کسی سے اپنی برتھ ڈے کا کیک کٹ نہیں رہا

بیس برسوں سے کوئی حسرت جواں کرتے ہوئے
کتنا خوں جلتا ہے خود کو رائیگاں کرتے ہوئے

موت کا اک راستہ کچھ پوچھتا ہے خواب میں
آنکھ کھل جاتی ہے جس پر فٹ سے ہاں کرتے ہوئے

ان کی قبروں پر بھی میں نے پھول رکھے ہیں جنہیں
موت آئی مجھ کو یکسر بے نشاں کرتے ہوئے

چیخ پڑتے ہیں تھکن سے چور اعصابِ بدن
سانس تک چھل جاتی ہے مصرع رواں کرتے ہوئے

بے کلی کی زد پہ میری روح ہے اور جسم بھی
ڈر رہا ہوں تیرے غم کو بے اماں کرتے ہوئے

اس کے جتنے عیب تھے ہم نے سب کے سب اپنائے تھے
اپنی رات کا سینہ چیر کے اس کی صبح لائے تھے

کھیتوں میں وہ آگ کے اندر آگ لگاتا بھیگا جسم
سچ پوچھو تو اس دن ہم جل جانے کو للچائے تھے

ویرانی کے بھید سے واقف دیواروں کا پیٹ ہوں میں
میں نے پیسے دے کر اپنے کان بڑے کروائے تھے

اس چوٹی کے پیچھے وہ جنگل ہے جس میں وحشت نے
مجھ کو گھر سے بے گھر کر کے آوازے کسوائے تھے

جسم کے نیلے پن اور پیلے پن نے رستہ روک لیا
ہم صرف اس کی جبیں سے لے کر ہونٹوں تک آپائے تھے

آوازوں کے دریا میں سب غرق ہوا تھا لیکن ہم
دروازوں کی خوشحالی کو دستک لے کر آئے تھے

دکھ نہیں ہے اگر اکیلے ہیں
بس اداسی کے کچھ وسیلے ہیں

اس ہتھیلی کو غور سے دیکھو
یہ لکیریں نہیں ہیں نیزے ہیں

کتنی معکوس ہے تری تقسیم
بات کڑوی کریلے میٹھے ہیں

چاند میں چاند ہیں مجھ ایسے لوگ
آم کے باغ میں سفیدے ہیں

حالتِ حال میں ہمارے پاس
ساری آسائشیں جھمیلے ہیں

عجب جنونی ہے پُرکھوں کا خون دیتی ہے
خرد پسندوں کو اذنِ جنون دیتی ہے

کسی، کسی میں پنپتا ہے ضبط کا مادہ
کسی، کسی کو جدائی سکون دیتی ہے

میں اضطراب کی وحشت خرید لایا ہوں
جو تیرے دھیان کی آتش کو بھون دیتی ہے

چراغِ ہجر پہ اُنگلی نہیں اٹھاتے دوست
یہ آگ صرف دکھوں کا تکون دیتی ہے

بدن میں آگ ہے بدلے کی سو وہ بچوں کو
غذا میں دودھ نہیں اپنا خون دیتی ہے

درد تیرا تھا ترے یار سے لگ کر رویا
یعنی بیمار تھا بیمار سے لگ کر رویا

چار سُو پھیل گیا زرد اُداسی کا حصار
کوئی در تو کوئی دیوار سے لگ کر رویا

سخت کہرام زدہ شخص تھا میرا ہمدرد
یوں لگا جیسے میں بازار سے لگ کر رویا

بیڑیاں کاٹنے لگتا ہوں ندامت سے میں
جب یہ سوچوں کہ درِ یار سے لگ کر رویا

نیند بے چین تھی بیمار کی آنکھوں کے لیے
خواب کا زخم عزادار سے لگ کر رویا

اگرچہ منسلک ہے تجھ سے حیرانی ہماری
مگر ہم مطمئن ہیں دیکھ پیشانی ہماری

خلا بھر تو لیا ہم نے تمہارے ساتھ لیکن
بہت لاغر ہوئی جاتی ہے ویرانی ہماری

حسد کرتی ہے گاؤں کی مقدس خاک ہم سے
مٹاتا ہی نہیں ہے تشنگی پانی ہماری

برائے رنج کوشش ہو گی تم سے کم ملیں ہم
بہت محتاط رہ جائے فراوانی ہماری

کسی کا لمس کھڑکی سے نکل جاتا ہے اکثر
اُبھر آتی ہے دیواروں پہ ویرانی ہماری

خاک سا زرد ہوں سبزایا ہوا لگتا ہوں
میں جو اس شوخ کا فرمایا ہوا لگتا ہوں

تُو مری آنکھ کا نَم دیکھ کے اندازہ لگا
میں کسی طور بھی اپنایا ہوا لگتا ہوں

میرے ماتھے پہ سیہ رنگ سے لکھا ہے نکل
سو میں بَن ٹھن کے بھی ٹھکرایا ہوا لگتا ہوں

خالی پن اُوپری سطحوں پہ مجھے رکھتا ہے
دیکھنے والوں کو میں چھایا ہوا لگتا ہوں

سخت مشکل تھی مری جان تجھے چومتے وقت
دیکھ دیوار سے ٹکرایا ہوا لگتا ہوں

یہ ہم سے مت پوچھ کس کا چہرہ لیے ہوئے ہیں
ہم اپنے گریے کے پاؤں چھو کر بڑے ہوئے ہیں

ہم آگ ہیں تو ہماری زد میں بتاؤ کیا ہے
اگر محبت ہیں پھر ابھی تک کسے ہوئے ہیں

جگر میں جیسے کوئی تپش ہے تری خلش ہے
کسے بتائیں کہ ہم سے کیا سانحے ہوئے ہیں

تمام مُردے ڈرے ہوئے ہیں اِدھر اُدھر کے
ہم اپنے لاشے کو خود اٹھا کر کھڑے ہوئے ہیں

بیا ہے جانے کا بخت چپ ہے، کرخت چپ ہے
مہیب عمروں کا فرق لے کر بڑے ہوئے ہیں

یہ میرے شعروں کا بانکپن ہے کہ شوقِ فن ہے
مرے کریڈٹ پہ قہوہ خانے کھلے ہوئے ہیں

اور تو کیا چھپا ہے آنکھوں میں
حیرتی آئنہ ہے آنکھوں میں

بخت کی تیرگی نگلتا چراغ
تھک کے سویا ہوا ہے آنکھوں میں

حضرتِ قیس تک رسائی کا
ممکنہ راستہ ہے آنکھوں میں

ایک سورج بدن میں سوتا ہوا
رات بھر جاگتا ہے آنکھوں میں

یوں نہیں ہے کہ اس کے ہونے کا
بانکپن رہ گیا ہے آنکھوں میں

ہم محبت گریز لوگوں کو
عشق نے آ لیا ہے آنکھوں میں

اب ایسا بھی نہیں کہ سرسری کرتے رہے ہیں
ہم اک مدت تک اس سے دلبری کرتے رہے ہیں

نیا دن بن رہا تھا، رات سے ہم آنکھ میچے
پرانے چاک پر کوزہ گری کرتے رہے ہیں

قدم اٹھتا نہیں تھا سانس پہلے پھول جاتا
سفر کے نام پر ہم بے گھری کرتے رہے ہیں

کچھ ایسی کھڑکیاں ہم پر کھلیں جن کے سبب ہم
بدن کے حبس سے شاخیں ہری کرتے رہے ہیں

اسی پاداش میں زائل گئیں آنکھیں ہماری
ہم اس زندان سے مُردے بَری کرتے رہے ہیں

یہ سانحہ بھی مرے قدم ڈھونڈتا رہا تھا
میں اس کی چاہت میں خود کلامی تک آ گیا تھا

زمین کے گول پن کی پختہ دلیل ہے دوست
ہمارا نوحہ کسی نے پہلے سے لکھ رکھا تھا

تمام دن روشنی بکھیری تو رات کو میں
چراغ کی ایک لَو کی خاطر بھٹک رہا تھا

یہ رائیگانی مرے قبیلے کو کھا گئی ہے
میں اپنے بچوں کو عشق کرنے سے روکتا تھا

مہیب دکھ تھا جو اس سبب مجھ سے چھن گیا ہے
کسی سے مل کر میں تازہ تازہ ہنسا ہوا تھا

میں دیکھتا تھا بچھڑتی آنکھوں کی اضطرابی
کسی کہانی میں شہر جاتی سڑک رہا تھا

لپٹ کے سوتا تھا چند خوابوں کی روشنی سے
اور ایک ٹوٹے دیے کے پہلو میں جاگتا تھا

کوئی اس طور سے اس کے حسنِ مکمل پہ نظمیں لکھے جا رہا ہے
کوٹ ادّو سے لاہور تک جس کے شہکار مصرعوں کا ڈنکا بجا ہے

پہلے پہلے تو صرف ایک مانوس سی بے کلی کی صدا سمجھی ہم نے
پھر کھلا پاس کی جھونپڑی میں کوئی حسرتوں کا بدن کاٹتا ہے

کش پہ کش لے رہا ہوں ادھر شعر پر شعر ہوتے چلے جا رہے ہیں
مجھ کو رختِ سخن صرف بے سمت وحشت بڑھاتے دھوئیں میں ملا ہے

مجھ پہ کنبے کا بارِ ندامت بہت ہے تمہیں خاک خوش رکھ سکوں گا
کوئی لڑکا پسند آئے تو اس سے شادی رچا لو اسی میں بھلا ہے

چھوڑ دو اس جہانِ خرافات کو بھاڑ میں جائیں سارے فریبی
میرے اندر کوئی شخص وحشت زدہ ہو گیا ہے بڑا بولتا ہے

یہیں کہیں تھا مجھے کیا پتہ کہاں گیا ہے
تمہارا دکھ جو مرے سامنے پڑا ہوا ہے

میں اس کے ہاتھ پہ لبیک لکھ کے لوٹ آیا
اب اس سے پوچھو اُسامہ کہاں بھٹک رہا ہے

مہیب طرز کے اجسام ہیں اداسی کے
بہت پرانا ہے کوئی، کوئی بہت نیا ہے

مجھے ملال ہے اس آئنے کی نیت پر
مرے بدن کی جگہ جو دھواں دکھا رہا ہے

ترا وجود مرے دل کے طاقچوں میں تھا
یقین کر یہ خزانہ اُچک لیا گیا ہے

پاؤں کا دھیان تو ہے راہ کا ڈر کوئی نہیں
مجھ کو لگتا ہے مرا زادِ سفر کوئی نہیں

بعض اوقات تو میں خود پہ بہت چیختا ہوں
چیختا ہوں کہ ادھر جاؤ جدھر کوئی نہیں

سر پہ دیوار کا سایہ بھی اداسی ہے مجھے
ظاہراً ایسی اداسی کا اثر کوئی نہیں

آخری بار مجھے کھینچ کے سینے سے لگا
اور پھر دیکھ مجھے موت کا ڈر کوئی نہیں

خودکشی کرتے سمے پوچھتا ہوں میرا عزیز
اور آواز سی آتی ہے تو مر کوئی نہیں

بھری دنیا ہے سسکنے میں جھجک ہو گی تمھیں
یہ مرا دل ہے ادھر رو لو ادھر کوئی نہیں

ایک دن لوگ مجھے تخت نشیں دیکھیں گے
یا یہ دیکھیں گے مرا جسم ہے سر کوئی نہیں

اس کی ہجرت بڑا اعصاب شکن سانحہ تھی
شہر تو شہر ہے جنگل میں شجر کوئی نہیں

بے خیالی سی مجھے گود میں بھر لیتی ہے
در پہ دستک ہو تو کہہ دیتا ہوں گھر کوئی نہیں

بادل ہیں آسماں ہے بتا اور کون ہے!

اس شور میں ہمارے سوا اور کون ہے؟

منظر میں خامشی کا اُگایا گیا وجود

اچھے سے دیکھ میرے سوا اور کون ہے؟

ظاہر ہے صرف اُسی کو بتانے ہیں مسئلے

اس کے سوا ہمارا خدا اور کون ہے؟؟

دیوار گر رہی ہے محبت کی اور ہم

دریافت کر رہے ہیں بچا اور کون ہے؟

چیچک زدہ اُداسی ملی تھی جہیز میں

جو روز پوچھتی ہے ترا اور کون ہے؟

یہ کس مقام پہ ہم مل رہے ہیں آپس میں
شناخت کرتے ہی رونے لگے ہیں آپس میں

مزید حبس کو بھرتی کیا تو حبس گھٹا
رگوں میں خون نہیں سانحے ہیں آپس میں

کچھ اس لیے بھی میں دوری سے ڈر گیا شاید
ہمارے کوزے بنے اور گندھے ہیں آپس میں

میں چاہتا تھا کہ ہم مشترک پہنتے کچھ
کفن کے رنگ بڑے ملے رہے ہیں آپس میں

کسی کا دکھ ہے، اُسامہ ہے اور کچھ بھی نہیں
خوشی خموش رہو دو بڑے ہیں آپس میں

کسی بدن کی نزاکت کے استعارے ہیں
یہ ہم جو خواب میں پھولوں سے خوف کھاتے ہیں

کہ عاشقوں کو وہ مشکل نہ ہو جو ہم کو تھی
سو اپنے حصے کی اک دوربیں بناتے ہیں

مجھ ایسے لوگ مقدر کی سوتنوں جیسے
زمیں سے دوری پہ پھٹتے ہوئے غبارے ہیں

یہ رائیگانی مجھے دیکھ کر بنائی گئی
سفید رنگ مجھے دیکھنے سے کالے ہیں

سنور رہا ہے مقدر کہ رائیگانِ عشق
غزل کو پڑھ کے مرادکھ سمجھنے والے ہیں

تمہیں جو آدمی جوکر دکھائی دیتا ہے
اُداس لوگوں کو پتھر دکھائی دیتا ہے

ہماری آنکھوں سے آگے فقط خلا ہے خلا
جہاں سے اندھوں کو منظر دکھائی دیتا ہے

حریمِ جان تمہیں نیند کا ہَرا فانوس
ہمارے خواب کی ٹھوکر دکھائی دیتا ہے؟

یہ مرتبانِ اذیّت بھی جنبشِ دل کو
فصیلِ جاں کے برابر دکھائی دیتا ہے

میں اپنے عشق میں ایسے مقام پر ہوں جہاں
تمہاری جوتی کا نمبر دکھائی دیتا ہے

منظر کی ویرانی کا
بھید کھلا عریانی کا

ہنسنے والو! تم پر بھی
سایا ہے ویرانی کا

رشتہ جانتے ہو نا تم
مچھلی کا اور پانی کا

پُرسہ دینے والے کو
علم نہیں حیرانی کا

عشق کی بھینی خوشبو نے
من مہکایا رانی کا

خفا خفا ہیں ابھی تو مگر گلے ملیں گے
جب اپنے چہرے ہمیں موت سے ہرے ملیں گے

یہاں ہوائیں کسی سوگ میں دِکھیں گی تجھے
یہاں کے جتنے کبوتر ہیں پر کٹے ملیں گے

یہ سب تماشا تری اک نگہ کی خاطر ہے
کئی کنویں میں کئی روڈ پر پڑے ملیں گے

تری کمی سے بکھرنے لگا ہے شیرازہ
تُو آئے گا تو تجھے ٹوٹ کر گلے ملیں گے

عجیب اذنِ سفر ہے تھکن رسیدہ لوگ
درونِ خواب بھی وحشت سے جاگتے ملیں گے

جاگتی آنکھ سے دیکھا ہوا خواب

صبح کے پانچ بجے!

خواب سے جاگا ہوا جسم

سرخ پوشاک میں آسیب نُما سایا لیے

مجھ کو سرطان زدہ دیکھ کے ڈر جاتا ہے

اور مرا سایا

مرے سامنے مر جاتا ہے!!

خدا کو میری نظمیں اچھی لگتی ہیں!!

خدا کو حُسن بھاتا ہے!!
کہ جیسے تم سراپا حسن ہو!
آدم کا سارا حُسن مانو تم میں آ کر ہار بیٹھا ہے!!
خُدا کو راگ اچھے لگتے ہیں
جن میں نبی ﷺ کی نعت پڑھتے ہو تو سب کو مست کر دیتے ہو!!
اپنے آپ میں تم آٹھواں سُر ہو!
سُریلے شاہزادے!
اور میں یہ آٹھواں سُر گنگناتے سیکھتے کتنی ہی نظمیں لکھ چکا ہوں!
اس کا اندازہ مجھے خود بھی نہیں ہے
ٹھیک بولا ناں؟؟
خدا کو عشق بھاتا ہے!
حقیقی عشق!!
نظمیں عشق ہوتی ہیں!!!
خدا کو وصل بھاتا ہے
کہ میں تو خود کئی نظموں کا محور موت کو گردانتا ہوں!

پھر وہ چاہے خواہشوں کی موت ہو یا میرے پیاروں کی!
خدا کو وصل کے سارے بہانے اچھے لگتے ہیں!
یہاں ''سرطان'' اور اسکی سبھی اقسام سنجیدہ مثالیں ہیں
خدا کو خاص نوعیّت کے دکھ بھی اچھے لگتے ہیں!
بہتّر کی کہانی دیکھ لو!
کربل! شہادت کی کہانی کم دُکھوں کی ڈھیر لگتی ہے!!
مسلمانوں کا عُقدہ ہے کہ ہر اک دکھ حقیقت میں
اُسی کربل سے آیا ہے!
دیانت سے بتاؤ میری نظموں میں
تمہیں دکھ، درد سے ہٹ کر ملا ہے کچھ؟؟
خدا کی کائناتِ بے کراں میں ایک اک تخلیق پر
نظمیں مرے سینے کے اندر کودتی پھرتی ہیں ہر لمحہ!!
خُدا کو سانحے بھاتے ہیں!!
کیونکہ سانحے موجب ہیں اس کو یاد کرنے کے
مری یہ نظم بھی تو سانحہ ہی ہے!!!

روایت کو بدلنے کی ضرورت ہے

اُسے کہنا غلط جانب سے آتی ٹھیک آوازیں
بَھلائی کے لیے ہوتی ہیں
جیسے ''ہم''
ہمارا ایک اک عُنصر کہانی ہے
کہانی بھی وہ جس میں آخری سطروں کے اندر
مرکزی کردار کا مبہم حوالہ ہو
ہمیں دیکھو۔۔۔۔
سکوتِ بے کراں سے پھٹتے اعصابوں پہ بنتی
گول موٹائی علامت ہے
کہ ہم اوروں کے حق کی نیند سوتے ہیں
ہمارے ہاتھ جو پہلے سفیدے کاٹنے کے کام آتے تھے
اب اک اونچی سڑک اور کھائی کا ''پُل'' ہیں
ہماری آنکھ سے بہتا ہوا کچھ حسرتوں کا ''تیل''
خوابوں کے پھسلنے کو بہت کافی ہے
جس میں رائیگانی کا کوئی امکان اضافی ہے

بھنویں! اک خواب سے چہرے پہ گہری ٹکٹکی رکھنے کے باعث
ایک سواستی کے اینگل پر سکڑ کر مَس ہوئی ہیں ایک دوجے میں!
ہمارے ہونٹ جن کو ایک فقرہ بولنا آیا کہ "ہم سے دور ہو جاؤ"
ہمارے بال جیسے اک تناؤ سے مُسلسل تن کے رسّے بن چکے ہیں
"ناک" کہہ لو کٹ چکی ہے جنگِ ہجراں ہار جانے پر
ہمارے کان پینڈولم کی گردش میں کئی مانوس آوازوں کے پیچھے
ہر منٹ بھاگے ہیں
اپنا جسم۔۔۔۔ جیسے دشت
ہر نقشِ قدم کو ثبت کرتا دشت۔۔۔
اپنا "دل" جو ہر دھڑکن میں بس اک بین چیخے جا رہا ہے کہ
"یہاں کوئی نہیں ہے!"
اور ہمارے پاؤں جو اُس کو روانہ کرنے جاتے ہیں
تو واپس گھر نہیں آتے
روایت کو بدلنے کی ضرورت ہے
یہاں ہم بخت سے ہارے ہوئے تیرہ شبوں سے کچھ نہیں ملنا
اُسے تنبیہہ کر دینا غلط بہتے ہوئے دریا سے خود ہی پیچھے ہٹ جائے
کہیں ایسا نہ ہو تیزی میں اس کی ذات کا اُجلا سنہرا بخت کٹ جائے

مبالغہ

اُس کے ہونٹوں پہ پھیلی ہوئی ماتمی سُرخی،

بھارت کے بُھوکوں کے اجسام میں جلتے دوزخ سے بھی

کچھ زیادہ بھیانک ہے!

اُس کی سیہ زلف خم کھائے تو

ایسا محسوس ہوتا ہے کاغذ پہ "زگ زیگ" سطریں

اسی خم زدہ زلفِ ناگن کی تقلید سے بن رہی ہیں!

وہ آنکھیں نہیں! "سین" میں تیرتی کشتیاں ہیں!

بدن ریت ہے!

وہ بدن،

چاندنی کو بھی اوقات میں لاتا اُس اپسرا کا بدن

ریت ہے!

اور کس کو پتا ہے کہ اس ریتلے جسم کو صرف چکھنے میں کتنے ہی دریا بدن!

تپتے صحرا بنے ہیں!

لاعنوان

پرانے فاردے کی شور سے آزاد سڑکوں پر چہل قدمی
صدی کے سب سے افسردہ مناظر میں
سرِ فہرست ہے
اخبار نہ آنے کے باعث آج مِس تھامس کے ماتھے پر
بہتر بل پڑے ہیں
سینٹ تھامس چرچ میں Jesus کے پاؤں پر گرا
صدیوں پُرانا اشک غائب ہو چکا ہے
لالٹین اپنی حرارت خرچ کرتی جا رہی ہے
خط میں آنسو عین اُس جا پر گرے ہیں
جس جگہ سب سے اہم باتیں لکھی تھیں
عشق میں ہارے ہوئے لڑکے اُداسی کا اثر چکھنے کی خاطر
سارا دن غمگین فلمیں دیکھتے رہتے ہیں
ان سب سانحوں کے بیچ جتنے قہقہے بجھنے کے عادی ہو چکے ہیں
ہم اکیلے ہجر کی راتوں میں اتنے خون آنسو رو چکے ہیں

Dark They Were & Golden Eye

کسے معلوم ہے تم سے جو اک شخص

دھرتی چھوڑ کر وینس "Venus" پہ مایوسی کا ٹاور

گاڑنے آیا ہوا ہے

سُرخ گالوں میں سیہ آوارگی کو خیمہ زن کرتی ہوئی

اُس فاحشہ کے فون سے

سب رابطہ نمبر اچانک اُڑ گئے ہیں

جس کے باعث اُس کے دونوں گال پیلے ہو چکے ہیں

کون اِس پر غور کرتا ہے

دھنک کی سبز پٹی کب سے غائب ہے!!!

سعودی مُملکت میں دھوپ کے ہوتے ہوئے

طوفانی بارش ہے

ٹریفک رُک گئی ہے اور اس گھمسان میں ہارن کی "پاں، پاں"

راستوں کے کان پھاڑے گی!!

صحارا (Sahara) دشت میں واحد کنواں

پانی کو دیواروں کے اندر جذب کرنے لگ گیا ہے

اور بے چارہ ''کرسٹوفر'' بھی پیاسا مر گیا ہے

اس صدی کی نظم کے بانی کی آنکھوں سے

اُداسی کی سبھی نظمیں مکمل کوچ کرنا چاہتی ہیں

سرزمینِ اولیا مُلتان میں سب خانقاہوں پر کبوتر

دانہ پانی چھوڑ بیٹھے ہیں

سوئیزرلینڈ میں سب سے بڑی چوٹی کے سائے میں

اکتیس سال سے ٹھہرا ''سنومین''

آج سردی کی شکایت کررہا ہے

اس خرابی کا ازالہ موسمی پنچھی پَروں کو کاٹ کر

پورا کریں کہ تم گزشتہ ایک گھنٹے سے

مسینجر، وٹس ایپ اور فیس بک سے آف لائن ہو!!!

اور تم آ گئی

اک سکوتِ مُسلسل سے ہارا ہوا جسم
سانسوں سے عاری نَسیں
ایسی فارغ رگیں جن میں خون وجنوں کی جگہ
چائے اور سگرٹوں کا دُھواں بہہ رہا تھا
محبت کے اسمِ گرامی سے وحشت زَدہ ذہن جو
'سارہ'، 'ثروت'، 'شکیب' اور 'آنس' کے نقشِ قدم تک
رسائی کی دُھن میں
جگہ بہ جگہ ریل کی پٹڑیاں دیکھتا تھا
کنویں سوچتا تھا!
دُکھوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہاتھ
جو بس اناروں میں ہی جنّتی دانے کی کھوج میں بجھ گئے
کٹ گئے اصل سے
اور پھر ایک دن زرد بختی کی قسمت پہ بھی
اک گلابی جَھڑی چھا گئی
میرے خالی زمان و مکاں کے احاطے میں تُم آ گئی!

جھیل آنکھوں کے مرکز میں اُس نرگسی پھول جیسی ہنسی
جس کی نازک بناوٹ میں اُن پانچ دریاؤں کا رنج تھا
جو کبھی نہ بہے
ہونٹ ایسی نزاکت کا منبع نظر آرہے تھے
کہ سب آبشاروں کو بھی شرم آنے لگی تھی
جبینِ کشادہ حیا کے گلابی
دھنک کے حسیں سات رنگوں میں گھلتی ہوئی
خوبصورت جبیں جو کبھی
آرٹسٹوں کے وہم و گماں کو بھی نہ چھو سکی تھی
مرے ہونٹ کی دسترس میں چلی آئی تھی
آگ کی دسترس میں چلی آئی تھی
عشق بھی آگ تھا
میں تو ویسے بھی ابلیس کی راہ کا ایک پتّھر رہا
تم کو معلوم بھی ہے تمہاری طرف آتے آتے مری آنکھ میں
رنج کی جتنی نظمیں تھیں سب بجھ گئی ہیں
یہاں جن کی نوحہ گری میں ستمبر کی گیارہ سے
سارے دکھوں کی رگیں تن چکی ہیں!!

یہ وقت کیا ہے؟

تمہارے جانے کے بعد سب کچھ

سکوتِ دو نیم کی وضاحت میں لگ رہا ہے

ہمارا بستر

مِلن کی گرمی جو سلوٹوں سے عیاں ہوئی تھی

وہیں پڑی ہے

وہ دھندلی کھڑکیوں پہ اپنے حساس پوروں سے

تم نے میرا جو نام لکھا

لکھا ہوا ہے!

طویل وقفے کی خامشی جو شریر چوہوں کے چیخنے سے

بحال ہوتی (تمہارے آنے سے پہلے)

اب پھر اُسی طرح ہے!!

تمہاری موجودگی میں سِگریٹ سے جی جلایا

(میں اب بھی ویسا ہوں شاہزادی)

تمہیں خبر ہے؟

مَیں آٹھ سمتوں سے بے کلی میں گھرا ہوا ہوں

تمہارے جانے کے بعد سب کچھ وہی ہے لیکن

مری گھڑی ہے

جو تین تینتیس (3:33) پہ رُک گئی ہے

سکھی کو دوسرا خط

سلامِ عشق! خیر و تندرستی کی دُعائیں!

ٹھیک ہو نا تم؟

یہاں سب ٹھیک ہے تُم فِکر مت کرنا!

سنا ہے بارشوں کا رُخ تمہاری سمت ہے

سوچا!!!

تمہیں تو کاغذی کشتی بنانا خوب آتا تھا

پرانا خط بھی شاید نذرِ بارش ہو چکا ہو!!!

اس لیے اک دوسرا خط لکھ کر

الماری کے T.C.S میں تم کو پوسٹ کر ڈالوں!

ڈلیوری تیز ہے خط آج ہی تم نیند میں موصول کر لینا!

جواباً آسماں پر کوئی تارہ ٹمٹمایا تو

مُجھے معلوم ہو جائے گا تم اب خیریت سے ہو!

یہاں سَب پہلے جیسا ہے!

میں اب بھی چائے کے دو کپ بناتا ہوں،

تمہارا کپ بھی مجھ کو پینا پڑتا ہے!

کل امّی کہہ رہی تھیں اتنی چائے مت پیا کر

رنگ کالا ہو رہا ہے!

مَیں ہنسا!! اور کچھ نہیں بولا!

تُمہارے دُکھ کو عیدوں پہ نئے کپڑے دلاتا ہوں!

یہی اک فرض میں پُوری دیانت سے نبھاتا ہوں!

مسلسل اشک پینے کے سبب آواز بھاری ہو گئی ہے!

فکر مت کرنا!!!

دوائی لے رہا ہوں ٹھیک ہو جائے گا کچھ دن میں!

تمہیں یہ جان کر اچھا تو شاید نہ لگے پر میں

غموں کے ایک اک پرچے میں اوّل آ رہا ہوں

تمہارے رنجِ بے پایاں کو میرے سُکھ ملیں

اپنا بہت سا دھیان رکھنا

والسلام!

اک رائیگاں عاشق

جہانِ خاک!!!!!!

Four Nights To See

(چار دِن کی چاندنی- پھر اَندھیری رات ہے)

مَیں اپنی زِندگی کا پانچواں دِن کاٹنے والا ہوں
سورج ڈوبنے کو دو منٹ کا وقت باقی ہے
مَساجد میں موٗذن اپنے اپنے مائیکوں سے لَب ملا کر
اُنگلیاں کانوں میں ڈالے
بختِ عالی شان کی تقسیم کو تیّار ہیں
(منظر سراسر نفِسیاتی ہے)
اَذاں ہوتے ہی میرے جسم سے
اُن چار ہیبت ناک کالے رَتجگوں کا زہر زائل ہو چکا ہو گا
جو اُس نے ہجر کی سُوئی سے میری ناتواں مَفلوج
رگ رگ میں اُتارا تھا
مُجھے پہلے پہل لگتا تھا میں ان رَتجگوں میں کچھ نہیں کر پاؤں گا

پَر رائیگانی کو دتی تھی

''میرا پہلا رت جگا''

اُس رات میں سب خشک نہروں اور دریا کی طرف

گریہ کناں ہونے گیا تھا

جن کی محنت اُن کی مٹّی پی گئی تھی

''دوسری شب میں''

مچھیروں کا غذائی فلسفہ منظوم کرنے متصل بستی گیا

جن کی خواتین اور بچّے،

شام تک ساحل پہ اس اُمیّد میں زِندہ نُما لاشیں

بنے موجود رہتے ہیں کہ مچھلی آئے گی

جھینگے ملیں گے

وہ مچھیرے جو ازل سے اَپنے بچّوں کو

یہی تبلیغ کرتے ہیں کہ پانی کچھ نہیں کہتا۔۔۔

مچھیرے جن کی مائیں اور بہنیں ٹاکیوں سے

پیٹ اور پستان کا بوسیدہ حصّہ ڈھانپتی ہیں

''تیسری شب'' بھوک کی آغوش میں گزری

مگر سویا نہیں میں

بھوک جس نے نظم گو شاعر کی اک تعداد کو

اپنی سُنہری کوکھ سے جنما ہے

''چوتھی رات'' کو میں تین راتوں کی تھکن سے چُور

اپنے بستر پر لیٹنے آیا

اور اب یہ ''پانچواں دن'' ہے

اذانِ مرگ سنتے ہی

مرے سب رَتجگوں کا زہر زائل ہو چکا ہے

جس کے باعث موت کا انسان

میری روح کے مابین حائل ہو چکا ہے

عیدِ سعید

تمہیں معلوم ہے تم کون ہو؟

تم شاہزادی ہو

اک ایسی شاہزادی جس کو یہ باور کرانے کے لیے

ہیروں نگینوں کی کوئی حاجت نہیں!!

دیکھو! تمہیں مَیں اپنا جیون بھی بُلا سکتا ہوں

لیکن کوئی فانی شے بطورِ استعارہ کیوں؟؟

محبت ایک لافانی عقیدہ ہے!

تمہیں معلوم ہے تم ہی وہ لافانی عقیدہ ہو

تمہارے سر سے پاؤں تک

مجھے اک ایک عنصر سے کئی شہکار نظمیں روز

آوازوں کے چنگل میں جکڑ لیتی ہیں!!!

جن کی قید سے زندہ نکلنا غالباً ممکن نہیں ہے!!

''تم''

اک ایسی نیند ہو جس کو کسی بھی خواب کی ٹینشن نہیں ہے

''تم''

اک ایسا پھول ہو

جس کی بناوٹ، وزن، خوشبو، رنگ اُس پر بوجھ ہیں

افطار کے اوقات میں سوکھے لبوں کی تشنگی ہو

جس کو پانی کی ضرورت ہے

''تم'' ایسا راگ ہو جس کی کوئی بندش نہیں ہے

صرف سُن سکتے ہیں لیکن گا نہیں سکتے

تمہارے وصل کی حسرت بدن میں پالنا

فالج کا پہلا نام تھا!!

لیکن مرے آنے سے پہلے!!!

مَیں انا زادہ!!!

تمہارے پاؤں کی ٹھوکر ہوا تو شاہزادہ بن گیا!!

میرے لیے تم ہی یکم شوّال کی پہلی خوشی ہو!!!

زندگی ہو!!!

مشورہ

یاد کے جزیروں میں
خوش نُما پہاڑوں کو
دیکھنے سے بہتر ہے
حفظ کر لیا جائے
اک نصابِ متروکا
صبح و شام پڑھنے سے
وقت تو گزرتا ہے
آگہی نہیں ملتی
ہجر کی ریاضت میں
وصل کی کوئی خواہش
ایک دم اضافی ہے

جسم کی لگاوٹ میں

اور جذبے ہوں تو ہوں

عشق ہو نہیں سکتا

آنکھ کی نمی جتنی

سوگوار رہتی ہے

کوئی غم نہیں رہتا

ایک ہی گزارش ہے

میری بے تُکی باتیں

دل پہ تم نہیں لینا

فردیات

پہلے پہلے رائیگانی ذہن پر حاوی ہوئی
اور پھر یہ سائے مجھ میں جا بجا ہونے لگے

....

اُس ایک شعلہ بدن کے ظہور سے پہلے
یہ جتنے آدمی دِکھتے ہیں برف ہوتے تھے

....

وگرنہ تیرگی میرا بدن اڑا جاتی
خدا کی خیر پرندے بنا دیے اس نے

....

رائیگانی، بے خیالی، ہجر، آشفتہ سَری
اور جو شے بچ گئی ہے دوستا وہ موت ہے

....

وصل وہ راہِ فنا ہے کہ طلب بڑھنے پر
آدمی مرگ سی حالت میں نظر آتا ہے

....

بعض اوقات تو چار آنکھوں سے ایک سمندر بنتا تھا
جب وہ اپنے دُکھ پر روتی اور میں اس کے رونے پر

....

مختصر وقت میں بربادی کا اندازہ لگا
اُس تعلق سے پرانے تو مرے کپڑے ہیں

....

شروع دن سے تعلق غلط سَمے پہ بنا
رہی سہی جو کسر تھی بچھڑ کے پوری ہوئی

....

اور ہم سانس کی عدّت کو پٹختے رہیں گے
روز اک موجِ ہوا چُھو کے گزر جائے گی

....

رشتہ گمانِ بد کے الاؤ میں جل گیا
بس چیخ رہ گئی ہے اُسامہ میں پاک ہوں

ٹھیک ہے ہجر سے پوروں میں خلل پڑتا ہے
پر یہ ہم لوگ جو پتھر کے ہوئے جاتے ہیں

....

تو شوقِ مرگ سے باہر نکل کے دیکھ مجھے
میں تجھ کو موت سے بڑھ کر حسیں نہیں لگتا؟؟

....

یعنی یہ خامشی بھی کسی کام کی نہیں
یعنی میں بین کر کے بتاؤں اداس ہوں؟

....

ہم ایسے لوگ محبت ہیں سو ہمارے ہاتھ
گلاب بیچنے والوں کو دان کر دینا

....

ہم اس لیے بھی کسی آنکھ کو کھٹکتے رہے
اُسے پتہ تھا کوئی راستے کا پتّھر ہے

....

پھر ایک شام بھڑکنے لگا جمالِ سُرخ
چراغ اچھال کے میں نے زمیں پہ پھینک دیے

قطعات

ضبط کرتے ہوئے آنکھوں سے نمی جھانکے گی
چور رستے سے کوئی چور گزر جائے گا
آئینہ خانہ بنا دوں گا مَیں اس کمرے کو
آپ کے کمرے میں جن گھستے ہی ڈر جائے گا

....

وحشتِ ہجر ادھر درد کے ماروں کو بھی دیکھ
کوئی تو رمز سُجھا ہم کو عزاداری کی
معذرت!!! علم نہ تھا مرگِ مَحبت بارے
مجھ تلک صرف خبر آئی تھی بیماری کی

منظر پہ بے بسی کی حکومت کا رنج الگ
آنکھوں میں نم نہ ہونے کا ماتم جدا کیا
کتنے ہی دَرد رونے کی بابت میں پاس تھے
پھر بھی تمہارے نام کا کسٹم جدا کیا

....

ہم اس دَھڑکے سے لگ کر اپنا دل رکھتے رہے ہیں
کہ نادانی میں اُس کے تِل پہ تِل رکھتے رہے ہیں
بچھڑ جاتا تو اُس کو عشق کے خَرچے دِکھاتے
ہم اپنی جیب میں ہوٹل کے بل رکھتے رہے ہیں

غزل کو مردود، متروک صنفِ سخن قرار دینے والے شاید زمینی حقائق سے واقف نہیں۔ غزل آج بھی اہم ترین صنفِ سخن ہے۔ مشاعروں میں نوجوان غزل گو شاعر اپنے خوبصورت اشعار سے سامعین کو حیرت و استعجاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اُسامہ خالد بھی ایسے ہی خوبصورت شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی غزل اپنے اندر بے پناہ امکانات رکھتی ہے۔ ''سفرزاد'' اپنے مجموعی تاثر اور فنی پختگی کی وجہ سے ایک عمدہ شعری مجموعہ ہے جس کی غزلیں اور نظمیں اس کی آمد کا جواز فراہم کرتی ہیں۔ میرے نزدیک اُسامہ خالد ایک زیرک نوجوان ہیں۔ وہ جدیدیت کے جنون میں لایعنیت کا شکار نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے غزل کی شعری روایت میں جدیدیت کا جھنگار (تڑکا) لگا کر غزل کو نئے ذائقوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کے یہاں انگریزی الفاظ تخلیقی تجربے میں ڈھل کر آتے ہیں اس لیے پڑھنے اور سننے میں بھلے لگتے ہیں۔

''سفرزاد'' کا شاعر، شعر کہنے کا ہنر جانتا ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اُسامہ خالد کی غزل آج کی غزل ہے جو قارئین کو متوجہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر فرتاش سیّد

میں "سفرزاد" ہوں اور یہ بھی بتا سکتا ہوں
ترے چہرے پہ پڑی گرد ہے کس رستے کی

اُسامہ سے پہلا تعارف یہ شعر بنا۔

یعنی یہ خامشی بھی کسی کام کی نہیں
یعنی میں بین کر کے بتاؤں اُداس ہوں؟

دوسرا تعارف یہ شعر:

ضعیف وقتوں میں اپنے کنبے کی ذمہ داری اٹھائی ہم نے
تمہارے ابو نے منہ دکھائی میں اس ہتھیلی پہ غم رکھا تھا

مجھے لگا کہ انسانی المیوں کو شعری کیفیت دینے والے شاعر کو مزید پڑھنا چاہیے۔ جیسے جیسے پڑھتی گئی ہر ایک سطر، ہر ایک مصرع، ہر ایک شعر سنجیدگی سے محسوس ہوتا گیا۔ جذبے کی شدت سے پھوٹنے والی خوشبو نے لفظوں کا پیرہن اوڑھ کر کمال خدوخال بنائے۔

اُسامہ کا اسلوب نیا ہے پرانے لہجوں پہ پلستر کرنے کی بجائے ایسا لکھا ہے جو براہ راست ذہنی و قلبی وارادت سے منسلک ہے خصوصاً نفسیات سے۔ اسامہ کے خیالات اپنے ہیں، تخیل عام نہیں، تجربات اور جذبات دونوں میں صداقت دِکھتی ہے۔ اُسامہ محض ادبی تصورات کے چوکھٹے میں مقید نہیں بلکہ ذاتی اظہاریہ رکھتا ہے۔ جدت پسندی کا غلبہ واضح ہے، عصری حسیات اور رومانیت بھی موجود ہے لیکن طبعی میلان رنج ورائیگانی ہے۔ تخلیق میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لئے ابھی اُسامہ کو دنیاوی علوم اور تربیت فن پر کمال حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسامہ کی طرح میں بھی اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ شاعر کو شعر کہنے سے مطلب ہونا چاہیے۔ اچھے یا برے شعر کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دینا چاہیے۔ نئے لہجے، نئے موضوعات نئے مضامین کو لے کے آگے بڑھنے والے اُسامہ خالد، میرے بہت پیارے چھوٹے بھائی میری مولا سائیں سے دعا ہے کہ تم ہمیشہ روشنیوں اور رنگوں کا سفر کامیابی سے طے کرو، تمھارے ہاتھوں میں گلاب رہے ایسا گلاب جس میں ایک بھی کانٹا نہ ہو۔ (آمین)

ہم ایسے لوگ محبت ہیں سو ہمارے ہاتھ
گلاب بیچنے والوں کو دان کر دینا

رابعہ بصری علوی